# سیرتِ مومنانہ کی تعمیر کے مرکزی نقاط

## (باطن کی تعمیر)

جناب صوفی نذیر احمد صاحب کشمیری

حصہ اول - انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوات والارض

(۱) جب انسان کی فطرت سلیم ہو، وہ اپنی پیدائشی حالت پر قائم ہو، اخلاقی قوتوں کو اس نے اسراف وتبذیر میں تلف نہیں کیا۔ جب وہ انسان "ملکوت السمٰوات والارض" پر امید وبیم کی نظر ڈالتا ہو اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے تو اسے سارے مظاہر کائنات خود اپنی طرح لاتعداد احتیاجوں میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ لہذا اس کی نگاہِ امید وبیم ان سب مظاہر سے واپس لوٹ آتی ہو۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک محتاج دوسرے محتاج کے لئے احتیاج کی زیادتی کا باعث تو بن سکتا ہے، مگر اس کے احتیاج کو دور کرنے کا باعث نہیں بن سکتا ہے۔ ٹھیک اس ہمہ گیر احساسِ احتیاج کے ماتحت اس کی فطرت رہنمائی کرتی ہے کہ اس سارے سلسلۂ احتیاج کو پورا کرنے والی کوئی ایسی ہستی قطعاً موجود ہو جو ان سارے احتیاجوں، ساری کائنات کے سارے مظاہر کے سارے احتیاجوں کو پورا کرتی ہے اور کر رہی ہے اس کی یہی فطرتِ سلیمہ اس کی رہنمائی اس بات کی طرف میں کرتی ہے کہ ساری کائنات کے سارے احتیاجوں کو پورا کرنے والی یہ ہستی قطعاً ایسی ہو سکتی ہے جو خود سارے احتیاجوں سے بری ہو۔ ذاتی طور پر اس کی صفت احتیاج کے بجائے غنائے مطلق ہی ہو سکتی ہے۔ یہ فطری انکشاف ہو جانے کے بعد فطرتِ سلیمہ رکھنے والا ہر انسان اپنے سارے جذبۂ والہیت کو ہر طرف سے سمیٹتا ہوا اس ہستیٔ کامل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اس مقام پر اس کے منہ سے عنوان میں درج شدہ کلمہ طیبہ نکلتا ہے۔ یہ اقرار ازل الازال میں "الست بربکم" کے جواب میں کہے ہوئے "بلیٰ" کا اس حیات دنیا میں پہلا

اظہار ہے۔ ازل الازال میں کہے ہوئے اس "بلیٰ" کا اس حیاتِ دنیا میں یہ پہلا اظہار توجہ الی اللہ کہلاتا ہے۔ یہ اظہار شعوری عبودیت کی طرف پہلا قدم ہے یا پہلا قدم اُٹھانے کا تہیہ ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ انسان کی اُمید و بیم کا مرکز مظاہر انفس و آفاق نہیں بلکہ ماورائے انفس و آفاق کی وہ ہستی کامل ہے جو خود تمام حوائج سے غنیٔ مطلق ہے مگر سارے سلسلے تخلیق کے تمام احتیاجوں کو پُورا کرنے والی ہے۔

ایک ضمنی مگر ضروری بات
خام اندیشوں کا طویل سلسلہ

خام اندیشوں کا ایک طویل سلسلہ پوری تاریخ میں ایسا بھی رہا ہے جو اس بنیادی توجہ الی اللہ کو کل دین و تمام عبودیت قرار دیتا ہوا اسے "عرفان" و "معرفت" وغیرہ کا نام دیتا ہے۔ حالانکہ یہ اصل مقصود کی طرف صرف رُخ کرنا ہے۔ اس منزل پر پہونچنے کے لئے ساز و سامان کی تیاری تو بعد کا مرحلہ ہے یہ تو وہ اِنابت الی اللہ ہے جو ہدایت الی السعادت کی ابتدائی شرائط میں سے ایک شرط ہے۔ وہ فرائض و واجباتِ مومنانہ جو اس منزل تک کامیابی کے ساتھ پہونچانے کی زادِ راہ بنتے ہیں یہ خام اندیش گروہ عموماً انھیں اہل ظاہر کے مراسم قرار دیتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ عوام کالانعام کی تربیت کے لئے یہ مراسم چاہے ضروری ہی ہوں مگر اصل معرفت سے اُن کا کوئی خاص تعلق نہیں "عرفا" اس سے بلند تر مقام رکھتے ہیں۔ پھر یہ خانہ ساز عرفا دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں (الف) ایک گروہ تو سچ مچ ان مراسم کے سلسلہ میں آزاد اور بے لاگ زندگی بسر کرتا ہے۔ انھیں اپنے مغالطِ نفس میں ایمان دار گروہ سمجھنا چاہیئے۔ یعنی یہ لوگ جیسا اعتقاد رکھتے ہیں اُس پر اُن کا عمل بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا سارے نقص و مغالطۂ نفس کے باوجود ان میں تضاد و نفاق کم ہوتا ہے لیکن ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کے دباؤ کے ماتحت "رسوم پرستی" کو بھی اپنے اوپر حاوی کر لیتے ہیں۔ یہ شاید اس لئے کہ رسوم پرست عوام کے لئے وہ بخیال خود اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتے جب تک ظاہری حلیہ اختیار کرنے میں عوام پسند شکل اختیار نہ کر لیں۔ ع

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

(یہ ضمنی مگر ضروری بات یاد رکھنے کی ہے۔ اب اصل کی طرف پھر رجوع کیا جاتا ہے۔)

(۲) "ملکوت السمٰوات والارض" کو اپنی طرح احتیاج و نقص سے ہر پہلو سے متصف دیکھنے کے بعد اور پھر اپنی اُمید و بیم کا رخ فاطر السمٰوات والارض کی طرف کرنے کے بعد دوسرا سوال اس فاطرِ کل

سے ایک زندہ رابطے میں بندھا ہوتا ہے۔ تاکہ ہم اس سے اپنے ہمہ جہتی احتیاجوں میں کفایت و کفالت طلبی کر سکیں۔ یہ سوال مسلسل ذکر اللہ سے اور دعا سے حل ہوتا ہے۔ ذکر و دعا کے واسطے کے بغیر ہماری عبودیت بالقوہ عبودیت بالفعل عبودیت نہیں بن سکتی۔ حالانکہ حیاتِ دنیا کی ساری مومنانہ کشمکش کا سارا مقصود ہی یہ ہے کہ ہماری بالقوہ عبودیت بالفعل عبودیت سے بدل جائے۔ بالقوہ عبودیت تو ازل الازال میں "الست بربکم" کے جواب میں "بلیٰ" کہنے کے ساتھ ہی ہماری فطرت کا ایک جزو لاینفک بن گئی تھی۔ اسی لحاظ سے نوعِ انسانی کو فطرۃً "مسلم" کہا گیا ہے۔ لیکن اس حالت میں ہم صرف بالقوہ عبد ہیں اور اس مخفی قوت کو قوی کرتے ہوئے اپنی ساری حیات پر ہر پہلو سے محیط کرنے سے ہم بالفعل عبد بن سکتے ہیں "بلیٰ" کا اقرار ایک نیا تخم تھا جو ہماری حیات مادی کی زمین میں ہماری رضا سے بویا گیا۔ مگر اس تخم کو وہ شجرۂ ابدیقا بنانا جو "اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء" کا مصداق بناتے ہوئے ہمیں حیاتِ ابدی کے لالہ زار میں کامیابی سے پہونچادے، سرتاسر اعمال صالحہ کی مسلسل مشق و تمرین پر منحصر ہے اور ان اعمال صالحہ میں ذکر و دعا کو اولیت حاصل ہے۔ انفرادی اخلاق کو دوسرا اور معاشرتی اخلاق کو تیسرا درجہ حاصل ہے۔

**ذکر و دعا کی ضرورت "عرفا" کی جہالت**

صدر میں عرفا کے ایک ایسے گروہ کا ذکر آیا ہے جو صرف توجہ الی اللہ کو کل سلوک الی اللہ اور سب کائنات عبودیت سمجھتے ہیں جس طرح عام اعمالِ صالحہ ان کے ہاں ماہیتِ عبودیت سے خارج ہیں اسی طرح یہ لوگ ذکر و دعا کو بازیچۂ طفلاں سمجھتے ہیں "معرفت کچھ اور چیز ہے" یہ فقرہ ان کا مخصوص اعتقاد ہے۔ حقیقت میں یہ مکتبِ فکر زندقے کا مکتب ہے۔ اس لئے کہ بلا واسطۂ ذکر و دعا عبودیت کی بالقوہ استعدادوں کو بالفعل بنا کر ہمہ گیر و ابد بقا کرنا متصور ہی نہیں حالانکہ یہی توجہ الی اللہ کی اصل غایت ہے۔ بلکہ ایمانداروں کی بات یہ ہے کہ ان کی یہ خانہ ساز "توجہ الی اللہ" حقیقت میں توجہ الی اللہ ہی نہیں۔ بلکہ جسے ان لوگوں کے ہاں توجہ الی اللہ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت "سکون نفس" کے وہ خاص لمحات ہوتے ہیں جب ہوائے نفس و تمنائے نفس کے طوفان وقتی طور پر تھم جاتے ہیں اور نفس میں ایک یکسانی و سکون کی حالت پیدا ہو جاتی ہے یہ حالت نفسانی قوتوں کا تسالم و سکون اور باہمی رضامندی کی حالت ہے۔ یہ حالت ہرگز وہ حالت نہیں جسے حقیقت میں توجہ الی اللہ کہا

جاتا ہے اور جس کی حقیقت یہ ہے کہ قلبِ انسانی سارے سلسلۂ انفس و آفاق کو محلِ زوال و نقص و احتیاج محسوس کرتا ہوا فاطرِ فطرت، صمدِ مطلق کی تلاش ماورائے انفس و آفاق کرنے لگتا ہے۔ مگر یہ مخصوص نفسانی حالت خارج سے ہٹکر اندر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ خالق انفس و آفاق فاطرِ فطرت سے ایک زندہ رابطہ بہم پہونچا کر اپنے تمام بندگانہ احتیاجوں کو اس کے ذریعہ پورا کرنے سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں۔ یہ سلوک تمام مکمل کامزہ کے ہاں بافراط پایا جاتا ہے جو سلوک بواسطۂ انبیاء ملتا ہے اور جو حقیقت عبودیت ہے اس میں ذکر و دعا، ابتدا بھی ہے وسط بھی ہے اور انجام بھی ہے۔ ابتدا میں ذکرِ مجرد و ذکرِ اسمار مفید ہوتا ہے۔ وسط میں ذکرِ مجرد کے ساتھ ذکرِ کلماتِ تامۂ الٰہیہ اور آخر پر تو دعا کو غلبہ ہوتا ہے۔ ابتدا میں ذکر اصولاً اور دعا ضمناً ہوتی ہے اور آخر میں دعا اصولی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور ذکر باوجود دائمی و اضطراری ہو جانے کے اہمیت میں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

**"عرفاکی" دوسری مہلک جہالت**

"ارے بھائی۔ صوفی و عارف کو صفات سے کیا واسطہ اس کا تعلق تو ذات سے ہوتا ہے" ان عرفاکی دوسری مہلک جہالت صدر کے فقرے میں درج ہے۔ جو غایت جہل سے اور حقیقت میں عبودیت کی رگِ حیات کو کاٹنے کے لئے باحیتوں کی تلوار ہے۔ انسان کی تمام اخلاقِ رذیلہ کو اخلاقِ حسنہ سے بدلنے کا واحد ذریعہ یہی صفاتِ الٰہی کا علم اور ان سے توسل ہے۔ اسی اور صرف اسی ذریعہ سے ہماری جبلتِ حیوانی ہماری فطرت انسانی کی مطیع و فرمانبردار اور اس سے ہم آہنگ ہوتی جاتی ہے۔ معرفتِ الٰہی حقیقت میں انھیں صفاتِ خداوندی کے مفصل علمِ صحیح اور ان سے توسل صحیح کا نام ہے اس لئے کہ اسی سے ہماری بالقوہ قسم کی فطرتِ اخلاقی بالفعل اور ہمہ گیر ہوتی ہوئی ہمیں ابدیقا کر دیتی ہے۔ یہی مفہوم ہے اس بات کا "ہمیں اللہ پاک کو ذات و صفات دونوں میں لاشریک ماننا ہے" بھلا صفات کو نظر انداز کر کے یہ بات کہاں ممکن ہے کہ ہماری بالقوہ استعدادیں بالفعل ہو جائیں اور ہماری عاداتِ بہیمی اخلاق مومنانہ سے بدل جائیں۔ اس لحاظ سے تمام وہ لوگ جو اس معرفت کی تلقین کرتے ہیں حقیقت میں اخلاقی اباحت کے لئے لاادریت کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ صفاتِ الٰہی کے توسل کے علاوہ ہماری اخلاقی تربیت کی کوئی بھی راہ و صورت نہیں اور جب تک ہمارے اندر ہماری اخلاقی

بصیرت کی غایت تربیت نہ ہو لے اس وقت تک دین و شریعت کے جواز و عدم جواز کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہوتی ۔ یہی اور یہی سبب ہے کہ یہ "عرفا" بہت جلد اس الہام سے نوازے جاتے ہیں کہ حدود شریعت و تقویٰ و اخلاق کو اُن پر سے ڈھیلا کر دیا جاتا ہے اور انھیں ان حدود سے مستثنیٰ قرار دیدیا جاتا ہے ۔ ادھر یہ ایک ناقابل انکار حق ہے کہ شدید ترین اخلاقی تربیت کے بغیر انسانی روحانیت کا راستہ نہیں کھلتا ۔ حیوانیت و روحانیت کے درمیان کی منزل اخلاقیت ہے ۔ جس کی عدم موجودگی میں روحانیت کا کوئی امکان بھی نہیں ۔ چونکہ خود بھی شدید روحانی تجربے کے کوچے کا آدمی ہوں لہذا اس بات کو ظاہر کر دینا دیانت محض سمجھتا ہوں کہ مجھے ایسے سارے "عرفا" روسیاہ و مسخ شدہ محسوس ہوتے رہتے ہیں اور بعض وقت اس احساس کے ماتحت مجھ سے شدت و سختی کا بھی اظہار ہو جاتا ہے (قلم کے ذریعہ یا زبان کے ذریعہ) مگر یہ صرف شاذ و نادر ۔ ورنہ اپنے احساس کو دبا لینے میں کامیاب رہتا ہوں ۔ بہرحال جو سلوک ہمیں بواسطۂ انبیاء ملا ہے اس میں ذکر و دعا مرکزی ذریعہ اور وسیلہ ہے ۔ یہ ذکر و دعا ہمارے قلوب و ارواح کو سو فیصد اپنے خالق حقیقی سے مربوط کر دیتا ہے ۔ اسے قرآن کی زبان میں "اعتصام باللہ" یا "جہاد فی اللہ" کہا جاتا ہے (من یعتصم باللہ فقد ھُدِیَ الی صراط مستقیم ۔

(۲) والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا) تمام انفس و آفاق کے مظاہر کو نقص و زوال و احتیاج سے متصف پاکر اصل فاطرِ فطرت کی طرف رجوع کرنا اگر عبودیت کی شرطِ اول تھی تو مسلسل و عاقد کر و مجاہدات سے اپنے فاطرِ فطرت سے صدفی صد مربوط ہو جانا عبودیت کا دوسرا زینہ یا قدم یا شرط تھی ۔ اسے سیر الی اللہ یا ایمانی جہاد یا سلوک الی اللہ یا اصلاح باطنی وغیرہ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس کا تعلق سر تا سر تطہیرِ قلب و روح و نفس سے ہے ۔ آدھا دینِ انسانی یہاں مکمل ہو جاتا ہے اور اس سب باطنی جہاد کا عنوان " انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین" ہے ۔ حقیقت میں اپنی نوعی و انسانی سعادت و شقاوت کی حقیقت کو معلوم کرنا ہی ایک حساس انسان کا وہ پہلا احتیاج ہے جسے وہ کائنات انفس و آفاق کے کسی بھی کونے کھدرے سے پورا نہیں کر سکتا ۔ ایک سعید الفطرت انسان کو یہ احتیاج یکسر تمام انفس و آفاق کے مظاہر سے بیزار کرتا ہوا اپنے معبود حقیقی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے ۔

اور حیوانی احتیاجوں کو پورا ہونے کے ذرائع اسے عام طور پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے ملتے ہیں اور مختصر سی حیوانی انداز کی کشمکشوں کے بعد وہ انھیں پُورا کرلیتا ہے۔ لیکن اس کا جو احتیاج اسے ساری کائنات کے تمام مظاہر میں سے کسی سے بھی پُورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا وہ اس کی اپنی سعادت و شقاوت نوعی کا احتیاج ہے۔ اسے دائمی توجہ الی اللہ و ذکر و دعا مجاہدات سے پُورا کرلیا جاتا ہے۔ یہ سیر و سلوک کا دائرہ ہے۔ یہ باطنِ دین ہے۔ انفرادی اخلاقِ حسنہ کا بڑا حصہ غیر شعوری انداز پر اسی سیر الی اللہ کے درمیان پُورا ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں انسان کی اخلاقی تربیت غیر شعوری طور پر ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ دائمی توجہ الی اللہ میں ہر غیر اللّٰہی تصوّر ایک روک محسوس ہوتا ہے۔ اور ہم جس قدر ذات کے ساتھ صفات میں بھی اللہ پاک کو لاشریک قرار دیکر اُس کے ساتھ اپنے آپ کو مربوط کرتے جاتے ہیں اسی مقدار سے ہمارے اخلاق ذمیمہ اخلاقِ حسنہ سے بدلتے جاتے ہیں۔ اس دوران میں انسان کی ساری اندرونی صلاحیتوں کا رُخ ایک ماورائی انفس و آفاق ہستیٔ مطلق کی طرف ہو جاتا ہے اور جس قدر ذکر و دعا کا ظاہر و باطن پر احاطہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر ہماری ساری باطنی صلاحیتیں اپنے مولا سے بندھ جاتی ہیں اور ہم پر اپنی ساری نوعی سعادت کی راہیں کھُل جاتی ہیں۔ "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" گویا ہدایت نوعی کی ساری راہیں ہمارے لئے کھل گئیں۔ ذکر و دعا و مجاہدہ اس کا ذریعہ بنا۔ اس دوران میں ذکر اللہ قلب و نفس سے شروع ہو کر ساری ظاہری و باطنی ہستیٔ انسانی پر محیط ہو جاتا ہے اور "یسبح للہ ما فی السمٰوات وما فی الارض" اور "ولہ اسلم من فی السمٰوات ومن فی الارض" ایک مجاز محض ہونے کے بجائے ایک حقیقت محسوسہ ہونے لگتی ہے۔ مگر ایسی باتیں آثار ہیں، مقاصد نہیں۔ مقصد تو تمام زندگی کا اپنے مولا کے ایک زندہ رابطہ میں بندھ جانا ہے اور لازوال ہونا ہے۔ اس تعمیر باطن کے تین رکن ذکر و دعا اور مجاہدہ ہیں

حصّہ دوم۔

## رجوع الی الخلق

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین

### تعمیر ظاہری (اعمال صالحہ)

جس طرح تعمیر باطن کے لئے "انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفا" کی ایک آیت

نصب العین کو معین کردیتی ہے اور ذکر و دعا و مجاہدہ انسان کی تمام روحانی قوتوں کو اس نصب العین سے ایک زندہ رابطے میں باندھ دیتا ہے اور جس طرح یہی زندہ رابطہ انسان کی تمام قوتوں کی حیوانیت سے تطہیر کرتے ہوئے ان قوتوں کو اخلاقی روحانی یا انفرادی اخلاق کی صورت میں تشکیل دیتا ہے بعینہٖ اسی طرح ہماری تمام ظاہری قوتوں اور ظاہری اعمال کے لئے " ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین " کی آیت ایک نصب العین معین کردیتی ہے ۔ ان میں افراط وتفریط اور اسراف وتبذیر کے دوگونہ مہلکات سے محفوظ کرتی ہوئی صرف صراطِ مستقیم پر محدود رکھتی ہے ۔ ٹھیک اس حرکتِ ثانیہ کے دوران معاشرتی اخلاق کی یکساں تکمیل کے لئے فقہیات وشرعیات حدود وقیود کا کام دیتے ہیں اور محبت الٰہی خشیت الٰہی رضائے الٰہی معاشرے کی خیراندیشی (جسے شرعی زبان میں " نصیحۃ " کہتے ہیں) اظہار کلمۂ حق اور اخلاص للہ محرکات کا کام دیتے ہیں ۔

## اخلاقی وروحانی محرکات کی تفصیل

### کل حقیقت دین و مذہب

(الف) محبتِ الٰہی " والذین اٰمنوا اشد حبا للہ ۔ محبت الٰہی تمام مثبت اعمال صالحہ کی محرک تام ہے ۔ جب انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ساری حیات کی کل تربیت وبقاء اور سب حفاظت ونما کے سارے خزانے اللہ پاک کے ہاتھ میں ہیں اور ساتھ ہی اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ رحمٰن ورحیم غفور وتواب ، رؤف ووہاب بھی ہے تو پھر وہ تمام مرضیاتِ اعمال کی تکمیل وبجاآوری کے لئے اس درجہ قوی وجسور ہوجاتا ہے کہ اسے کوئی رُک ، رُک محسوس نہیں ہوتی اور کوئی خوف عمل صالح سے روک نہیں سکتا ۔

رحمٰن ورحیم ، غفور وعفو تواب ووہابِ مطلق کی محبت ہی جو اس کے لئے دریاؤں اور سمندروں کو پایاب اور صحراؤں اور پہاڑوں کو ہموار کرتی جاتی ہے ۔ اللہ پاک کی تمام صفات جمالی اس کے جذبۂ محبت کی آبیاری کرتی جاتی ہیں ۔ تلافیٔ مافات کرتی جاتی ہیں اور وہ بڑے بڑے مرحلے کو طے کرنے کے بعد اس سے بھی بڑے آئندہ کے مرحلے کو طے کرنے کے لئے اپنے آپ کو تازہ دم پاتا ہے ۔ باطنِ دین کی سیر الی اللہ میں حقیقتاً محبت کا جذبہ ہی کام آتا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ تمام اقوام وملل کے روحانیین کی طرح

اسلامی صوفیا بھی محبتِ الٰہی کو تمام اعمال کا محرک تام بتاتے ہیں حالانکہ وہ صرف سیر الی اللہ میں مفید ہے۔ اس دنیا میں بحیثیت عبد متمکن ہوتے ہوئے حیاتِ ابدی کا سامان شعوری طور پر کرنا تو سرتاسر خشیتِ الٰہی پر منحصر ہے۔ چونکہ صوفیا نے زیادہ تر محبت ہی کو تمام اعمال کا محرک مانا ہے۔ لہذا اس کے باعث کتاب دین کے سارے ابواب اپنی قدرتی ترتیب سے محروم سے معلوم ہونے لگتے ہیں جس کے باعث باطنِ دین کی تکمیل کا نصب العین ہی سرے سے مستور ہو کر محض باطنیت بنا دیا جاتا ہے یا صرف باطنیت رہ جاتا ہے۔ جہاں محب و محبوب کی ثنویت کو ختم کرتے ہوئے دونوں کا ایک ہونا یا ایک کرنا ہی کمال سمجھا جاتا ہے۔ اور اس طرح دین و آئین کی ساری حدود کو جلا کر خاکستر کرتے ہوئے

"من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی"

کا معاملہ کر دیا جاتا ہے۔ اب دین و شریعت کے تمام وہ سانچے جن میں ڈھل کر انسانی صلاحیتوں کو اخلاق حسنہ بننا تھا اور اس طرح آئندہ کی منزل سفر کے لئے زاد تقویٰ مہیا کرنا تھی وہ سب جلا کر ایک طرف پھینک دیئے جاتے ہیں۔ محبت کی اس امتیاز سوز ڈگری یا درجے کا نام "عشق" رکھا گیا ہے۔ اور اس حضرت عشق کی خاصیت "ہر چہ جز معشوق یا شد جملہ سوخت" ہے اس کا کام محب و محبوب کی ثنویت کو ختم کرتے ہوئے دونوں کے اتحادِ ذاتی کا فتویٰ دینا ہے۔ حالانکہ جب کوئی وارفتہ مزاج بگمان خود اس حالت پر مقیم ہو گیا اس وقت بھی اگر اس کے پیٹ کا آپریشن کیا جائے تو وہی خون و نجاست اس میں سے نکلے گی جو دوسرے عامی انسان کے پیٹ سے نکلتی ہے اس وقت بھی اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا جائے یا اس کی گردن پر تلوار چلائی جائے تو نتیجہ وہی ہوگا کہ جو ایک عام انداز کے آدمی کے سلسلے میں ہوا تھا ادھر ہر مسافر سفر کے آغاز میں اس بدیہی یقین و ایمان سے چلا تھا کہ محبوب حقیقی (اللہ) تمام صفات و کمال سے متصف اور تمام نقص و زوال سے منزہ ہے۔ مگر حضرتِ عشق محب کو بالقوہ انسان سے بالفعل انسان بنانے کا مشن تو پورا نہ کر سکے۔ البتہ محبوب حقیقی کو تمام نقائص کا معروض ہونے کا فتویٰ ضرور مہیا کر گئے۔ یہ مذہب عشق چھپی دہریت ہے۔ اس میں "فاطر السموات والارض" کی ہستی (جو تمام صفاتِ کمال سے متصف اور تمام نقص و زوال سے منزہ ہے) سے کھلا کھلا انکار تو نہیں ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ اللہ پاک تم ہم کے مجموعے (انفس و آفاق) سے علاوہ

کچھ بھی نہیں۔ پہلے قدم پر تو اللہ پاک کی شخصیت کا انکار ہوتا ہو اور محض "علم" "رحمت" "سرور" وغیرہ صفات سے اس کی تعبیر کر دی جاتی ہے مگر آخر کار بھگتی مارگ کا یہ مکتبِ فکر کائنات کے حسی وجود کا منکر ہو کر اور اسے محض واہمہ کی تخلیق بتا کر کائنات کے محض ذہنی وجود کا قائل ہو جاتا ہے اور پھر خدا کو اسی داخلی قسم کے وجودِ کائنات کا ہم معنیٰ اور ہم وزن قرار دیتا ہوا انکارِ ہستیٔ حق میں بالکل مادیین کا انکارِ ہستیٔ باری تعالیٰ میں ہمنوا ہو جاتا ہے۔ مادیین تو کائنات کے وجودِ حسی کے علاوہ حق و واقعیت کا کوئی وجود ہی نہیں مانتے اور یہ باطنیہ گروہ واقعیت و حقانیت کو کائنات کے ایک داخلی قسم کے ادراک سے زیادہ کچھ نہیں مانتا۔ ہستیٔ حق کا منکر ہونے میں دونوں برابر ہیں۔

**مذہبِ عشق کی حقیقت غایتِ جہل کا نام کل معرفت**

محبتِ الٰہی بلا شک پہلا محرک دین ہو۔ مگر یہاں ابتدا سے انتہا تک عبد و معبود کا غایت امتیاز اور اسی کے تقاضے سے تمام فرائضِ بندگی کی نہایت احتیاط سے بجا آوری پیشِ نظر رہتی ہے۔ بلکہ یہ محبت بلا شبہ تمام مثبت اعمال و فرائض کی محرک ہو (انبیاء علیہم السلام کی زندگیاں پیشِ نظر رکھ لی جائیں نہ کہ غیر ذمہ دار وارفتہ مزاجوں کی زندگیاں) لہذا اس میں محب و محبوب کی ثنویت کو ختم کرنا تو کیا ان اعمال میں بھی تغافل نہیں ہوتا جو محبوب کی طرف سے اس کی رضا کے حصول کے لئے معین ہوتے ہیں بلکہ پورے ہوش و حواس سے ایک ایک عمل صالح کو اس کی پوری حدود ملحوظ رکھتے ہوئے بجا لانا ہوتا ہے۔

**ایک پُر لطف واقعہ**

کئی برس کا واقعہ ہے کہ علی گڈھ میں ایک "عارف" صاحب کے ہاں نشست تھی۔ ادھر دیوانِ شمس تبریزؒ کے حسب ذیل اشعار سے یار لوگ لطف اندوز ہو رہے تھے۔

عجباً دو رکعت است ایں عجبا چہارم است ایں — عجباً چہ سورہ خواندم چو نداشتم زبانے
بخدا خبر ندارم چو نماز می گذارم — کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

ان اشعار پر خوب سر دُھنے جا رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے اور محظوظ ہونے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ تھوڑے تھم تھماؤ کے بعد راقم نے مولوی صاحب سے ذرا سنجیدگی سے دریافت کیا کہ مولوی صاحب اگر کسی شخص پر بے ہوشی کا اتنا غلبہ ہو کہ اسے معلوم ہی نہ رہے کہ نماز میں کچھ

پڑھا بھی گیا یا نہیں، رکوع بھی ہوا یا نہیں وغیرہ تو کیا حضرت ابوحنیفہ قسم کے فقہا کے فیصلہ کے مطابق اس کی نماز ہو گئی یا...... میں نے نہایت سنجیدہ اور متین انداز اختیار کر لیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے سوچنے کے بعد مولوی صاحب نے جواب دیا کہ "اس حالت میں تو نماز نہیں ہوئی" اس کے ساتھ ہی میں نے پوری ہوشیاری سے کسی دوسری بات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس وقت مجھے ایک بات سمجھانا تھی۔ بحث مقصود نہ تھی اس ضمنی واقعہ کے بعد عرض ہو کہ عبد کی معبود کے ساتھ محبّت ایک فقیر الی اللہ کی ایک غنی مطلق سے محبّت ہے۔ یہ حسنِ ظن سے شروع ہو کر محبت کے دائرے میں آنا اور پھر محبّت سے رضائے الٰہی کی طرف بڑھنا ہے جو سرتا سر ہوش وحواس کے کمال کا مقام ہے۔ یہی سبب ہو کہ پورا قرآن "یعقلون تعقلون۔ یعلمون، تعلمون یتفکرون" "ویتدبرون" "اُولوالالباب" وغیرہ کا ایک مسلسل سلسلہ معلوم ہوتا ہو۔ لیکن سُکر وجذب وعشق وغیرہ کا اس میں اشارہ تک نہیں۔

**والذین آمنوا اشدُّ حباً للہ سے ایک مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش**

اس آیت میں "مومن" "اللہ" اور "محبّت" یا شدتِ محبّت" کا ذکر ہے۔ ایمان نام ہے حالاً ہی نہیں مقالاً خدا کو اپنی ذات وصفات میں لاشریک ماننے کا۔ یہاں جو محبّت مذکور ہو وہ اسی ایمان سے متفرع ہو۔ ایمان باللہ اس سلسلہ کا اعتبارِ اول ہو اور محبّت اس کا اعتبارِ دوم ہے اور پہلے اعتبار پر مبنی ہے۔ اگر ایمان کے اعتبارِ اوّل کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ دوسرا اعتبار خود سے خود نفی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اطلاقی رنگ کی اس اعتبار سوز محبّت کا یہاں ہرگز ذکر نہیں جسے عشق کہا جاتا ہے اور جس کا سارا مالہ وماعلیہ یہ ہے کہ "ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت" اور جہاں ثنویتِ مُحِب ومحبوب کو ختم کرتے ہوئے نقص وزوال واحتیاج کے مجموعے کو غنی مطلق کا عین بناڈالنا اور اس کا اعلان کر دینا ہے۔ یہ ایک بداہت ہے کہ ایسا کرنے اور کہنے والے اس حالت میں بھی اپنے ذاتی نقص وزوال واحتیاج کی صفات سے متصف رہتے ہیں۔ اس بداہت کے بعد ان دعاوی کو "خلل ہو دماغ کا" کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہو۔ ع کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہو دماغ کا"

(ب) خشیت الٰہی۔ "ان الذین یخشون ربھم لھم مغفرۃ واجر کبیر"

محبّتِ الٰہی کے بعد دوسرا دینی محرک خشیتِ الٰہی ہے۔ "یہ کرنا ہوگا" یعنی مثبت اعمال کا محرک

اصولاً محبت الٰہی ہوتی ہے اور "یہ نہیں کرنا ہوگا" یعنی منفی اعمال کا اصولی محرک خشیتِ خداوندی ہوتا ہے۔ مومنین کی صفت یدعوانہم رغباً و رہباً " یدعون ربھم خوفاً و طمعاً " ہے خشیت خداوندی روحِ تقویٰ ہے۔ بعض وقت عمر بھر کے اعمال مثبتہ صالحہ ایک بے احتیاطی سے اکارت ہو جاتے ہیں۔ ایک بچے کو ماں ساری عمر دودھ مکھن جیسی غذاؤں سے تربیت کرتی رہے۔ مگر ایک دن غلطی سے بچہ شکر کے بجائے سنکھیے کے ڈبے میں سے ایک چمچ بسا ہوا سنکھیا دودھ میں ڈالدے تو اس کی حیات کا ختم ہو جانا ایک یقین ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ کیفیت منفی اعمال سے بچنے کی ہے۔ بعض وقت ایک منفی عمل بھی ایمانی حیات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ مگر حیات جسمانی کی تربیت ہو یا حیات ابدی کی، ایسے مفاجاتی اعمال شاذ ہوتے ہیں، کبھی کبھی ہوتے ہیں۔ زیادہ تر بربادیاں چھوٹی موٹی بے احتیاطیوں سے ہوتی ہیں۔ حیاتِ جسدی میں جس طرح مفید و مضر کا زیادہ خیال نہ کرنا اکثر بیماریوں کا سرچشمہ بنتا ہے اسی طرح حیاتِ اخلاقی و حیاتِ روحانی میں اتنی بربادیاں کبائر سے نہیں آتیں جتنی صغائر یا لغو اعمال سے آتی ہیں۔ یہ لغویا صغائر انسان کے اخلاقی یا روحانی حاسہ کو کند کر دیتے ہیں پھر صغائر و کبائر کی حدود مشتبہ ہو جاتی ہیں اور بالآخر سرے سے یہ حس ہی ختم یا مختوم کر دی جاتی ہے۔ اس سارے سلسلۂ غت ربود سے بچانے والا محرک "خشیتِ الٰہی" ہوتا ہے۔ ابتدائی مراحل میں صرف کبائر سے بچا جاتا ہے مگر اجتناب عن الکبائر کے باعث اخلاقی و روحانی حس قوی تر اور تیز تر ہوتی جاتی ہے اور وہ حیات انسانی کو کبائر کے ملحقہ صغائر و لغویات سے بھی محفوظ کرتی ہوئی " یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربك راضية مرضية فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی " کے گلزار بے خار میں لے آتی ہے۔ رضائے الٰہی جو خشیت الٰہی کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے "اجر کبیر" کا مصداق ہو۔

(7) مقامِ رضا۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ذالك لمن خشی ربه "

محبت و خشیت کے محرکات دیر تک جدلی ( Dilactical ) انداز پر مصروفِ کار رہتے ہیں۔ یعنی کبھی محبت الٰہی کے غلبہ سے انسان مصروف فرائض رہتا ہے اور کبھی خشیت الٰہی کے غلبہ سے۔ یہ تبادلی سی کیفیت دیر تک چلتی ہے۔ اس کے بعد محبت و خشیت کا امتزاج ہونے لگتا

ہے اس طرح کہ محبت کا محرک خشیت میں تحلیل ہونا شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جب محبت پوری طرح خشیتِ الٰہی میں تحلیل ہو جائے تو پھر اس خشیتِ ممتزج کا دائرۂ اثر قلب وصدر کی دنیا سے وسیع تر ہوتا ہوا نفس پر بھی محیط ہو جاتا ہے (ظاہراً و باطناً نفس پر محیط ہو جاتا ہے) اور نفس ہوا پرستی و تمنا ہائے خام کے بجائے مطمئنہ ہو کر اپنے رب سے "راضیۃ مرضیۃ" ہو جاتا ہے۔

اب محبت و خشیت، ممتزج حالت میں ایک قوی تر شبت محرک کی شکل اختیار کرتا ہوا بالاستقلال نفس کا ملکہ بن جاتا ہے۔ اس حالت سے پہلے اعمالِ صالحہ کے کرنے میں مجاہدے کی کیفیت کا غلبہ رہتا تھا۔ یہ اعمال مجاہدہ اور تکلف محسوس ہوتے تھے۔ مگر اب تمام اعمال صالحہ ایک طبعی اُفتاد بن جاتے ہیں۔ جس طرح بھوک کے دباؤ سے کھانا ایک مجاہدہ کے بجائے ایک طبعی اُفتاد اور فرحت محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح رضائے الٰہی کے حصول کے بعد اعمال صالحہ ایک طبعی افتاد اور ایک فرحت و انبساط بن جاتے ہیں۔ یہی "اجر کبیر" ہے۔ یہ اس دنیا میں بھی بہشت کی زندگی کے مبادیات میں سے ہے۔ اس سے پہلے اعمالِ صالحہ ایک تلخ دوا یا زیادہ سے زیادہ پرہیزی غذا کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر اب لذیذ غذا کی حیثیت رکھتے ہیں، طبعی تقاضا، و افتاد بن جاتے ہیں۔ قلب وصدر میں ذکر اللہ کے قائم ہو جانے کے نتیجہ میں یہاں محبتِ الٰہی و خشیتِ الٰہی کا غلبہ ہوا تھا اور اب قلب وصدر کی کائنات کے بعد نفس بھی اس جنود اللہ کے مفتوحات میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ممالک محروسہ سرکار عالی ہو جاتا ہے اور وساوس شیطانی کی آماجگاہ کے بجائے وارداتِ الٰہی کا محل بن جاتا ہے۔ ؎

مصر ویران کردہ اور دادی ایمن نہاد رود نیل شوق یعنی گریۂ موسائے من

## لطیفۂ نفس و عقل انسانی کا جمع بعد از تفرقہ

### مغالطات کی ایک دنیا

یہ ایک مغالطہ ہے کہ انسانی دماغ میں جو حس مشترک ہے اور جسے ذہن بھی کہا جاتا ہے پوری تاریخ میں اس کو عقل انسانی بھی بتایا گیا ہے۔ اور چونکہ یہ حسِ مشترک ہنگامی سود و زیاں کے چکر ہی کی پابند ہے اور اس دائرے سے باہر آنا اس کی حدود عمل سے نظرتاً خارج ہے اور چونکہ فطرت انسانی

صرف ہنگامی سود و زیاں پر ایک دن کے لئے بھی قانع نہیں ہو سکتی اور لگاتار اپنی آنی مصلحتوں کو ابدی حیات کے مقصد سے جوڑتی رہتی ہے۔ لہذا فطرتِ انسانی کی یہ غیر قناعت پسندانہ بے چینیاں اسی مصنوعی عقل انسانی یعنی دماغی حسِ مشترک کو کوسنے پر بھی اُتر آتی ہیں اور چونکہ اس خانہ ساز خرد سے اپنی گتھیاں سلجھتی ہوئی محسوس نہیں ہوتیں لہذا اس سے مخلصی کی راہ خرد کے بجائے جنون میں تلاش کی جاتی ہے۔

انسان ذی خرد کو جنون کی تلاش ۔ یا للعجب ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر
خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے — بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے — خرد بیزار دل سے دل خرد سے

حقیقت یہ ہے کہ دماغ کی یہ حسِ مشترک سرے سے عقل انسانی ہے ہی نہیں۔ یہ تو وہی حس مشترک ہے جس کا وظیفۂ حیات مفید و مضر کی تمیز ہے نہ کہ نیک و بد اور شقاوت و سعادت کی تمیز۔ ساتھ ہی یہ حس مشترک انسانی خصوصیات کے دائرے سے خارج ہے۔ یہ انسان و حیوان کے درمیان مشترکہ ہے جس طرح حیوان مفید و مضر کی تمیز کرنے کے لئے اس لئے مجبور ہے کہ اس تمیزِ مفید و مضر کے علاوہ وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح اپنی حیاتِ جسدی کے لئے تمیز مفید و مضر کرنے کے لئے انسان بھی مجبور ہے اور یہ اس کی زندگی کا حیوانی اور طبعی وظیفہ ہے۔ اب یہ کس درجہ کی حماقت ہوگی کہ ہم اپنی آنکھ کو اس لئے پھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائیں کہ اس سے ہم سب کی لذتِ بلبل کے ترنم کا کیف اور گلاب کی خوشبو وغیرہ محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ خرد دشمنی ہم میں ہماری اس حماقت سے پیدا ہوئی کہ ہم نے خود ہی یہ فرض کر لیا تھا کہ حسِ بصر کے ذریعہ ہم اپنی سب گتھیاں سلجھا لیں گے اور ہمارے سارے آفاقی علوم کے حصول کے لئے یہ ایک حس کفایت کر جائے گی۔ اب چونکہ بصر سے ہمارے یہ تمام مزعومے پورے نہیں ہو سکے لہذا ہم اسے پھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ کم از کم اس کی مسلسل توہین ہمارا دائمی وظیفہ ہو گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مفید و مضر کی تمیز کو یکسر نظر انداز کر کے ہم اپنی طبعی زندگی کو دس دن کے لئے بھی محفوظ نہیں کر سکتے۔ ہماری جسدی حیات کی بقا کے لئے اس حس مشترک کا باقی رہنا اشد ضروری ہے۔ لہذا اسے ختم کرنے کے منصوبے سوچنا انتہائی مضرت خیز حماقت کے علاوہ اور

کچھ نہیں۔ اُدھر اس کے فطری وظیفۂ حیات سے زیادہ کام کی اس سے توقع کرنا ایک دوسری مہلک حماقت ہے یہ ذہن وہ عقل انسانی نہیں جو شعورِ نیک و بد سے متصف ہو بلکہ یہ وہ حس حیوانی ہے جو جسدی مفید و مضر کی معرفت رکھتی اور جو ہماری حیاتِ جسدی کے لئے ضروری ہے۔

**عقل انسانی کی حقیقت اور اس کا محل** | یہ ایک حقیقت ہے کہ عقل انسانی اس نورِ بصیرت کا نام ہے جو نیک و بد میں تمیز کرتی ہے۔ نیکی سے متمسک اور بدی سے اجتناب کا حکم دیتی ہے اور اس کا محل دماغ نہیں بلکہ دل ہے۔ "افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا"۔ "افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا"۔ قرآن مجید میں "تدبر" "تفکر" "تعقل" "تذکر" وغیرہ قسم کی جس قدر اصطلاحات ہیں وہ سب کے سب اسی عقلِ انسانی کے وظائف ہیں اور انھیں کو بحال کرنے سے عقل انسانی اپنے کمال کو پہونچتی ہے اور اسی کے کمال کو پہنچنے پر سارے کمالات انسانی کا دارومدار ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نورِ بصیرت کا محل عقل سلیم ہے۔ تمام الہامی کتب اس حقیقت پر متحد اللفظ ہیں۔ اور پھر یہی عقل انسان و حیوان میں فارق و ممیز قوت ہے۔ اب اس کے ساتھ حدیث کا وہ ٹکڑا بھی سامنے رکھ لیا جائے جو کل حیاتِ انسانی کی اصلاح و فساد کو صلاح و فسادِ قلب کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

**مقام رضا کی خصوصیت** | جب محبت کا خشیت میں امتزاجِ تام ہونے کے بعد اس ممتزج حقیقت کا محل قلب و صدر کے بجائے نفس انسانی بن گیا تو رضائے الٰہی کا ظہور و نزول ہونے لگتا ہے اور جب اس رضائے نفس پر ظاہراً و باطناً پورا احاطہ کر لیا تو خیر و شر و نیک و بد کی کشمکش کا خاتمہ ہو کر نفس صرف مرضیات الٰہی کا برضا و رغبت پابند ہو گیا اور حیاتِ آنی و مادی و حیاتِ جاودانی و ابدی میں سے سارا تضاد و تخالف ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ بلکہ سارے کے سارے حواس خارجی قلب کے ادراک کے اس درجہ تابع ہو جاتے ہیں کہ "فانہ ینظر بنور اللہ" ایک امر واقعہ ہو جاتا ہے۔ بی یسمع و بی یبصر و بی ینطق" اسی مقام رضا رہی کا اپنے کمال کے آخر درجے کو پہنچنا ہے۔

ایمانیات میں سے ہر امر زائد سے تطہیر | "دع مایریبك الی مالا یریبك" اور اعمال میں سے ہر لغو و زائد سے اجتناب "من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه" اور وہ ایمان و عمل کے دونوں دائروں میں ہر ضروری سے گذر کر تمام مناسبات کا احاطہ کر لینا اس مقام کی کل حقیقت ہے اور یہ سب کا سب سلسلہ از ابتدا تا انتہا ذکر و دعا سے گتھا ہوا چلتا ہے۔ ابتدا میں ذکر و مجاہدہ غالب عنصر ہوتا ہے اور دعا دوسرا عنصر ہوتا ہے اور آخر پر دعا، ساری کشودِ کار کا مرکزی ذریعہ اور ذکر حاصل شدہ ایک مخفی ذریعہ ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ یہ سارا تدبر، تذکر، تعقل و تفکر فرع ہے، مقامِ عبودیت کی اور مقام عبودیت کے مرکزی دو ستون ذکر و دعا رہیں۔ بلا شک و شبہ اور بلا ایک صرف گو مگو کے عرض ہے کہ جس تدبر و تفکر، تعقل و تذکر کو ذکر و دعا کے متوازی ایک آزاد راستہ قرار دیا جاتا ہے وہ "معرفتِ حق" کے بجائے ضلال و اضلال و تضلیل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ وہ اسی عالم خلق کی سیر انفسی ہے۔ وہ دین کی صراطِ مستقیم کسی صورت نہیں۔ راہِ دین کا قدم اول ہی سارے سلسلۂ انفس و آفاق کو محلِ تقص و زوال و معروض احتیاج و افتقار قرار دینے کے بعد فاطرِ کائنات کی ماورائے انفس و آفاق تلاش سے شروع ہوا تھا۔ "انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین" کے اس موقفِ خاص کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ جس موقف میں حضرت ابراہیمؑ نے یہ اظہار فطرتِ انسانی کیا تھا۔ اس موقفِ خاص میں شرک کے معنے سوائے اس کے اور کچھ بنتے ہی نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ تمام مظاہر انفس و آفاق کو اپنے کسی بھی انسانی مطالبے کو پورا کرنے کے یکسر ناقابل پاتے ہوئے خالقِ انفس و آفاق کو اپنی عزیمت کا قبلۂ توجہ بتا رہے ہیں اور اعلان کر رہے ہیں کہ اب میں اپنے مخصوص بندگانہ احتیاجوں کو پورا کرنے کے لئے کبھی ان مظاہر کی طرف توجہ کرنے کا نہیں۔ انھیں اپنے بندگانہ حوائج کے پورا کرنے میں شریک بھی نہیں مان سکتا۔ کہاں یہ حالتِ تمیز اور کہاں یہ بدتمیزی کہ خود اسی انفس و آفاق کے مجموعے کو اپنا خالق مان کر اور سارے عقل و خرد سے کلی انقطاع کرتے ہوئے اپنے آپ کو اسی میں فنا کر دینے کا منصوبہ بنانا اور اسے "تفکر" کہنا اور عبودیت کے متوازی حصولِ مقصد کا ایک شاہ راہ بتانا۔ یہ زندقہ و بیدینی ہے۔ جامع جمیع

صفاتِ کمال فاطرِ فطرت سے کلی انقطاع ہے جو غایتِ جہل و نہایتِ ضلال ہے۔ حالانکہ جب تک انسانی مخصوص صلاحیتوں کا سو فیصدی اس فاطرِ برحق سے ایک زندہ رابطہ نہ ہو جائے اس وقت تک انسان کی حیاتِ اخلاقی کی بھی کوئی بنیاد پیدا نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ اس سے انسانی روحانیت کا مرحلہ سر ہو جائے۔ بہرحال مقامِ رضا میں چونکہ نفس کے تمام داعیے ختم ہو کر نفس رضائے حق کے نور کا ایک ظرفِ محض بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر حیاتِ ظاہری و حیاتِ باطنی کا سارے کا سارا تضاد بھی یکسر ختم ہو جاتا ہے اور تمام ظاہری و باطنی فرائض و واجبات کی بجا آوری میں ایک طبعی یُسر پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام ظاہری و باطنی اعمال تلخ مجاہدات کے بجائے لذیذ غذاؤں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ "یا ایتہا النفس المطمئنۃ۔ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی" یہ کمالِ عبودیت ہے اور جنت کی زندگی کا آغاز ہے۔ توجہ الی اللہ کے ہر مرحلے پر جس طرح "انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین" ایک نصب العین کی طرح سامنے رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح سیرِ نزولی میں یعنی اعمال کے دائرے کی تکمیل کے آخری درجے تک "اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ایک معین نصب العین کا کام دیتا ہے۔ پہلی چیز کو سیرِ ایمانی اور دوسری کو سیرِ اعمالی قرار دیا جا سکتا ہے۔ پہلی سیر سر تا سر ماورائے انفس و آفاق ہے اور دوسری سیر عالمِ انفس و آفاق میں مقامِ انسانی کے تمکن سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ عبد کا اسی دنیا میں دینی تمکن ہے۔ پہلی سیر میں صفاتِ خداوندی سے ایک زندہ رابطہ بہم پہونچاتے ہوئے اپنی حیاتِ اخلاقی کے ضروریات کے مہیا کرنے کی راہ درست کرنا ہے اور دوسرے میں اسی اخلاقی حاصل شدہ بصیرت کو حیاتِ جسدی پر بہمہ وجوہ حاوی کرتے ہوئے اسے انھیں اخلاقی جوازوں اور عدمِ جوازوں کا پابند کرنا ہے۔ مقامِ رضا پر عبد اپنے ظاہر و باطن کی پوری تکمیل کر لیتا ہے اور اب اس کی حیات کے سارے مصنوعی تضاد جو پہلے واقعی محسوس ہوتے تھے ختم ہو کر اس کی زندگی صحیح معنیٰ میں ایک وحدت بن جاتی ہے۔ "یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" (باقی آئندہ)

---